(غلام گردش)

اولڈ ہوم

تین دن پہلے، بچپن کے ایک دوست کا رات گئے فون آیا۔ پورے تیس برس بعد رابطہ کیا تھا۔ حادثات زمانہ ہیں کہ وہ ساتھی جنکے دم سے زندگی آباد رہتی تھی، عملی زندگی میں مصروفیت کے تحت خواب سے بنکر رہ گئے۔ حسن ابدال سے لیکر میڈیکل کالج تک ہر دم اکٹھے رہے۔ ستر اور اسی کی دہائی میں تمام فلمیں اکٹھی دیکھیں۔ بات فون کی ہو رہی تھی۔ بالکل پرانی آواز مگر از حد کمزور انداز میں بات کر رہا تھا۔ دل میں ہر طرح کے گمان پیدا ہونے لگے۔ میرا نام لیکر کہنے لگا کہ آ کر لیجاؤ۔ میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ جتنی تیزی کر سکتا تھا جو اس عمر میں ممکن ہے۔ پھرتی سے تیار ہو کر اسکے ٹھکانہ پر پہنچ گیا۔ دراصل وہ ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں عرصے دراز سے رہ رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ یہ بذاتِ خود ایک افسوسناک کہانی ہے۔ کمرے میں پہنچا تو ڈاکٹر صدیقی پہلے سے موجود تھا۔ صدیقی بذاتِ خود ایک انتہائی ہمدرد انسان ہے۔ میڈیکل کالج میں اس سے کوئی خاص واسطہ نہیں تھا۔ بلکہ بہت کم رابطہ تھا۔ جب دیرینہ دوست کو تیس برس بعد دیکھا تو بالکل نہ پہچان سکا۔ کہاں چھ فٹ کا وجیہہ نوجوان اور کہاں ایک انتہائی بیمار آدمی جو سانس تک مشکل سے لے رہا تھا۔ دراصل اسکی نازک حالت دیکھ کر نجی ہوسٹل والے بھی کمرہ خالی کروانا چاہتے تھے۔ پہلا کام تو اسے ہسپتال لیجانا تھا۔ جسے ڈاکٹر شاہد اور ڈاکٹر کامران نے کسی کو بغیر بتائے خود ہی کر ڈالا۔ پنجاب انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں۔ پر اب سوال یہ تھا کہ اسکے بعد اپنے دوست کو کہاں لیجایا جائے۔ کسی کے گھر رہنے کے بھی قابل نہیں تھا۔ کیونکہ سانس اور دل کا مرض بری طرح اسیر کر چکا تھا۔ جس ہسپتال میں لیکر گئے تھے۔ انہیں بھی حد سے زیادہ رش کی وجہ سے بیڈ کی ضرورت تھی۔ یعنی ایک انسان جو ہسپتال میں دو تین دن گزارنے کی وجہ سے قدرے ٹھیک ہو گیا تھا اب اسے کہاں منتقل کیا جائے۔

عزیز و اقارب، کوئی بھی نہیں تھے۔ اس مقام پر یک دم خیال آیا کہ اولڈ ہوم یعنی بزرگ آدمیوں کو رکھنے کا کوئی تو ادارہ ہوگا۔ یہ تو علم تھا کہ مغرب میں ہر شہر اور قصبہ میں اولڈ ہوم ہیں۔ کیا لاہور میں بھی ہونگے۔ اسکا جواب ہم تمام دوستوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ گوگل پر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ لاہور شہر میں کئی نجی اولڈ ہوم موجود ہیں۔ ان میں سب سے معروف ہوم، پاکستان کے سب سے بڑے کاروباری ادارے کا تھا۔ فون پر ایک نیم مہذب خاتون نے بتایا کہ انکے پاس کمرہ موجود ہے۔ تین وقت کا کھانا بھی فراہم کرتے ہیں۔ جب اخراجات کا پوچھا تو دوائی کے بغیر ساٹھ ہزار روپے بتایا گیا۔ یہ وہ ادارہ ہے جس نے پاکستان میں اعلان در اعلان کر رکھا ہے کہ خلقِ خدا کی بھرپور خدمت کرتا ہے۔ لاکھوں لوگوں کو مفت کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔ غریب لوگوں کیلئے کمال کی امداد کیجاتی ہے۔ بہر حال باہم مشورہ سے تمام دوستوں نے فیصلہ کیا کہ درست ہے، اپنے مریض ساتھی کو وہیں داخل کروا دیتے ہیں۔ کم از کم بنیادی دیکھ بھال تو مہیا ہو پائیگی۔ مگر اگلا مرحلہ عجیب و غریب سا تھا۔ بلکہ کافی حد تک غیر متوقع بھی۔ جب اولڈ ہوم کے عملہ کو بتایا کہ درست ہے، آپ کمرہ مختص کیجئے، ہم، مریض کو لا رہے ہیں۔ تو پوچھا گیا کہ اسکی صحت کیسی ہے۔ جواب دیا کہ اسکی حالت قدرے بہتر ہے۔ مگر سانس اور دل کا عارضہ لاحق ہے۔ پھر ہم نہیں داخل کر سکتے۔ کیونکہ اگر کوئی بزرگ شخص، کسی مرض کا شکار ہو اور اسکی طبی دیکھ بھال کرنی پڑے، تو وہ ہم نہیں

کر سکتے اور انہیں داخلہ بھی نہیں دیتے۔اب خود اندازہ لگا لیجئے۔کون سا بوڑھا انسان ہوگا، جو کسی مرض کا اسیر نہ ہوگا۔اور کون ہے جو اپنی مرضی سے ایک یکسر تنہا جگہ پر صرف اسلیے جائیگا کہ وہ کسی موذی مرض کا شکار ہے۔یہ تو مکمل بے بسی کا کھیل ہے۔جب انسانی رشتے جواب دے دیں، تو پھر مجبوری میں انسان، ہمارے جیسے ملک میں کسی اولڈ ہوم کے متعلق سوچتا ہے۔

اندازہ فرمایئے۔کہ ہم ،تین چار دوست صرف اس سوچ میں ہلکان تھے کہ اب کیا فیصلہ کیا جائے۔یعنی، پرائیویٹ ہوسٹل، گورنمنٹ ہسپتال اور نجی اولڈ ہوم، تمام ادارے ایک ایسے بوڑھے مریض کو لینے کیلئے تیار نہیں تھے، جسے واقعی مدد کی ضرورت ہے۔انٹرنیٹ سے بھی ایک دوسرے اولڈ ہوم کا نمبر ملا۔فون کیا، تو بتایا گیا کہ یہ تو عرصہ دراز سے بند ہو چکا ہے اور اب اسے ایک گودام بنا دیا گیا ہے۔تیسری جگہ فون کیا۔فیروز پور روڈ پر واقع ایک کالونی میں موجود اولڈ ہوم سے رابطہ ہوا۔سوال کیا کہ ایک بزرگ مریض کیلئے کمرہ چاہیے۔جواب تھا کہ اگر سنگل کمرہ چاہیے تو اسکا کرایہ پچاس ہزار ماہانہ ہوگا۔اگر کسی کے ساتھ کمرہ شیئر کرنا ہے تو پھر پچیس ہزار، ماہوار۔دوایاں اپنی ہونگیں۔نوکر رکھنا ہے تو اسکا معاوضہ الگ۔فون اُٹھانے والے شخص سے گزارش کی کہ آپ مجھے دو تین گھنٹے کا وقت دے دیجئے۔دوستوں سے مشورہ کر کے مریض کو لانا چاہتا ہوں۔فون سننے والے نے قہقہہ لگا کر کہا۔جناب، یہاں تو اگلے منٹ کا پتہ نہیں۔دو تین گھنٹے کا انتظار تو بہت زیادہ ہے۔مطلب تھا کہ بھائی جان، فوری طور پر آ جاؤ۔پیسے دو اور کمرہ لے لو۔دس منٹ کا وقت مانگ کر کامران کو فون کیا تو ڈاکٹر شاہد بھی ساتھ تھا۔وہ دونوں، بالکل اسی اولڈ ہوم کی طرح رواں دواں تھے، جہاں میری بات ہوئی تھی۔فیصلہ یہی ہوا کہ اس اولڈ ہوم میں اپنے دیرینہ دوست کو منتقل کر دیتے ہیں۔اوسط درجے کا کمرہ، درمیانے درجہ کی کالونی اور کسی بھی معیاری طبی سہولت کے بغیر، پچاس ہزار روپے ماہوار پر کمرے لینے کا انتہائی مجبوری کا فیصلہ تھا۔

جزئیات میں جائے بغیر عرض کرنا چاہتا ہوں۔انسان اگر بزرگی کی گراں منزل کی طرف روانہ ہو تو اسے سب سے زیادہ اپنے پیاروں میں رہنے کا دل چاہتا ہے۔اولاد کے ساتھ، اور اگر وہ نہ ہو، تو کسی قریبی رشتہ دار کے ساتھ۔ہر بوڑھے انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے اپنائیت نصیب ہو۔زیادہ دیر نہیں تو چلو، تھوڑی دیر کیلئے، خوش رہے۔مگر یہ صرف خواہش ہی ہو سکتی ہے۔کئی بار بدنصیبی اس طرح گھیر لیتی ہے کہ انسان صرف اور صرف بے بس ہوتا ہے۔اسکی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔عزیزوں کا وجود ہی نہیں ہوتا یا وہ اسے رکھنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔اولاد، بوڑھے والدین یا بزرگوں کو سوائے بوجھ کے کچھ نہیں سمجھتی۔اس صورتحال میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ہمارے جیسے ملک میں جہاں ہم تمام دن، اپنی بہتر خاندانی، روایات پر بات کرتے رہتے ہیں۔اس میں ایسے لوگ جو کسی بھی وجہ سے پختہ عمر میں اکیلے رہ گئے ہیں، انہیں کہاں رکھا جائے۔اولڈ ہوم مجبوری میں ایک راستہ تو ہے۔مگر پچاس سے ساٹھ ہزار مہینہ کتنے فیصد لوگ ادا کر سکتے ہیں۔دوائیوں کا خرچہ الگ۔زندگی کے اور بہت سے بکھیڑے ہیں۔ملا جلا کر زندہ رہنے کا مکمل پیکج کوئی ایک لاکھ کے لگ بھگ بنتا ہے۔ہمارے ملک میں جہاں روزگار کم سے کمتر ہوتا جا رہا ہے۔جوان نسل کیلئے انکی تعلیم کے مطابق نوکریاں ملنی ناممکن ہیں۔کیا کوئی اپنے بزرگوں کیلئے اتنی رقم خرچ کر سکتا ہے۔مشکل سا سوال ہے۔جواب کم از کم میرے پاس تو نہیں ہے۔میرے والد تو ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد انتقال کر گئے تھے۔والدہ فالج کی بیماری میں چھ سال مبتلا رہیں۔اس میں کم از کم ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا۔جس میں میری

اہلیہ، بہنوں اور بچوں نے انکی خدمت نہ کی ہو۔ مجھے تو اولڈ ہوم کے خیال سے ہی وحشت سی ہوتی ہے۔ بھلا اپنے پیاروں کو کسی اور کے حوالے کیا جا سکتا ہے؟ میرے لیے تو یہ ایک ناممکن صورتحال ہے۔

مگر زندگی کے تھپیڑے انسان کو وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں، جو وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ انہی میں اولڈ ہوم کی زندگی ہے۔ جہاں کم از کم دوائی دینے کیلئے کوئی تو موجود ہوتا ہے۔ چلیے، بات کرنے کیلئے بھی کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے۔ ہاں، ایک مزید عرض کرنا چاہونگا۔ ایک انتہائی دردِ دل رکھنے والے کمشنر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ جو ملک کے مایہ ناز شاعر بھی تھے۔ چند ماہ پہلے ان سے بات ہوئی۔ تو بتانے لگے کہ لاہور سے اسلام آباد منتقل ہو چکے ہیں۔ وہاں انکی چھوٹی بہن رہتی ہیں۔ عجیب سا لگا کہ انکے پاس تو لاہور میں گھر بھی تھا۔ پھر اسلام آباد جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ بتانے لگے کہ بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بچے اور بچیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ گھر میں کوئی بھی فرد موجود نہیں۔ کوئی تو ہونا چاہیے، جو دیکھ بھال کر سکے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ اپنی چھوٹی بہن کے پاس منتقل ہوا جائے، تاکہ کسی دم کا سہارا تو ہو۔

سوچنے کی بات ہے۔ کہ اگر انسان اس ملک میں واقعی بے وسیلہ ہو جائے اور بڑھاپا بھی ہو، تو اولڈ ہوم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ اب اسکا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حکومت، معیاری سطح کے اولڈ ہومز بنوائے تاکہ موت کی سرحد کی طرف گامزن لوگ کچھ وقت، بہتر طریقے سے گزار لیں۔ نجی شعبے کا حال تو عرض کر چکا ہوں۔ وہ اسے بھی ایک بھرپور کاروبار میں کامیابی سے تبدیل کر چکے ہیں۔ حکومتی سطح پر ''شیلٹر ہومز'' کی بات ضرور کی گئی ہے۔ انکی اصلیت کیا ہے۔ کم از کم اکثریت کو بالکل معلوم نہیں۔ ٹی وی پر نظر ضرور آتا ہے کہ وزیراعظم شیلٹر ہومز میں کھانا کھا رہے ہیں۔ بڑی بڑی تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں۔ مگر کسی بھی غیر جانبدار ادارے یا شخص نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی، کہ شیلٹر ہومز کے معیار کے متعلق لکھ سکوں۔ شائد اب وہ وقت آ گیا ہے کہ جب بدقسمتی کسی بزرگ کو گھیر لے تو صرف اور صرف اولڈ ہومز ہی کفالت کیلئے رہ جائیں۔ صاحب یہ نام سنکر ہی ڈر لگتا ہے۔ اولڈ ہوم۔

راؤ منظر حیات